

## کامیاب مدرس کی دس نمایاں اور امتیازی خوبیاں

از: مولانا سید احمد نعمانی

حضرت مصعب بن زبیر رحمہ اللہ نے اپنے صاحب زادے سے فرمایا: ”اے میرے لخت جگر! علم حاصل کرو۔ اگر تمہارے پاس مال ہو تو یہ علم تمہارے لیے باعثِ زینت اور شانِ افتخار ہے۔ اور اگر تمہارے پاس دنیا کی دولت نہ ہوئی تب بھی یہ علم تمہارے لیے کسی متاعِ بے بہا سے کم نہیں۔“

دینِ اسلام ہر جہت سے کامل و اکمل ہے۔ اس کے کمالات و محاسن اور فضائل و مناقب میں سے ایک نمایاں خوبی اور ممتاز وصف ”علم و جی“ ہے۔ قرآن و سنت نے جا بجا مختلف مقامات پر حصولِ علم کی ترغیب و تشویق دے کر، یہ امر واضح کر دیا ہے کہ ایک عالم و عارف کبھی بھی کسی جاہل و نادان کے برابر نہیں ہو سکتا۔ ان کے درمیان کسی مساوات و ہم سرب کی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ”علم“ ہی ہے جس کی طرف سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نسبت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”میں معلم و استاذ بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“ آج بھی جو حضرات تعلیم و تعلمِ دین سے منسلک اور وابستہ ہیں، ان کی حیثیت، مرتبت اور اہمیت مسلم ہے۔ بقول حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ: ”تعلیم (دین) کی حالت دوسرے کاموں کے مقابلے میں ایسی ہے، جیسے انجن کا پیرہیہ کہ اس کے چکر پر تمام گاڑیوں کو حرکت ہوتی ہے۔ اگر اس کی حرکت بند ہو جائے تو تمام گاڑیوں کی حرکت بند ہو جائے؛ مگر اس کی ضرورت کا احساس لوگوں کو نہیں ہوتا۔ درس و تدریس (دین) سب محکموں کی روح ہے۔ خواہ تقریر ہو، خواہ تحریر، خواہ تصنیف سب اسی تعلیم (دین) کی فرع ہیں؛ مگر اس وقت سب سے زیادہ اسی کو بے کار سمجھ رکھا ہے۔ عام طور سے لوگوں کی نظر میں علماء کی وقعت کم ہے۔“ (تحفۃ العلماء 1/69)

آج کے مادہ پرست، ظاہر بین اور بناوٹ شعار زمانے میں مجموعی طور پر ”مدارسِ دینیہ“ بحمد اللہ ایک معلم و مدرس کو اس کا وقار و عزت و لیے ہی فراہم کرتے ہیں، جو اس کے منصب و مقام کا تقاضا ہے۔ مرو و ریام نے جہاں طلبہ علومِ دینیہ کو تن آسان، سہل پسند اور غفلت کا خوگر بنا دیا ہے، وہاں اساتذہ اور مدرسینِ علومِ نبویہ کی ذمہ داریاں

اور ان کے بلند رتبہ مقام کے تقاضے بھی پہلے سے کئی گنا بڑھ چکے ہیں۔ سستی، بے فکری اور عدم توجہی کی اس تاریک و سیاہ فضا میں وہ کون سے ایسے قابل توجہ اسباب و عوامل ہیں، جن کو برت کر ایک کامیاب مدرس و معلم اپنے متعلمین و مشین کی صلاحیتوں کو دو آتشہ کر سکتا ہے؟ جن سے استفادہ کر کے وہ اپنے لیے کامیابی و کامرانی کی راہیں ہموار کر سکتا ہے؟ جن کی بنیاد پر امت بیضا کو معتبر رجال کا اور مستند افراد دین مہیا کیے جاسکتے ہیں؟ آئیے! ایک اجمالی مگر مؤثر انداز میں ان سوالات کا جواب تلاش کریں:

### ۱- وقت کی پابندی:

پابندی وقت ہر عقل مند انسان کی خوبی ہے۔ تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرنے اور کروانے کا بنیادی اصول مقررہ وقت کا بھرپور اور درست استعمال ہے۔ اپنے وقت کی کامل حفاظت اور اسے تول تول کر خرچ کرنا ہی کامیاب تدریس کی جانب پہلا قدم ہے۔ اس حوالے سے ذرا سی بے التفاتی و بے توجہی اور تساہل نہ صرف علمی، عملی اور اخلاقی رویے کے منافی ہے؛ بلکہ زیر تدریس شاگردوں پر بھی اس کے برے اور منفی اثرات پڑ سکتے ہیں۔ جو یقیناً ان کے بہتر مستقبل کے حوالے سے زہر قاتل ہے۔ وقت کا التزام یہ تو اچھی اور قابل تحسین عادت ہے؛ البتہ اپنے گھنٹے سے قبل دوسرے استاد کے گھنٹے کا وقت لیا جائے اور نہ ہی مقررہ وقت ختم ہونے کے بعد دوسرے مدرس کے اوقات میں بے جا دخل اندازی کی جائے۔ متعین ساعتوں میں اپنی بات سمیٹنا اور تکمیل تک پہنچانا اخلاقاً و شرعاً ایک مدرس کی ذمہ داری ہے۔

### ۲- تفہیم سے قبل فہم:

وقت کو معتدل انداز میں اسی وقت اپنے لیے کارآمد اور مفید بنایا جاسکتا ہے، جب آپ تعلیم گاہ میں جانے سے پہلے متوقع سبق کو خوب اچھی طرح دیکھ چکے ہوں۔ بسا اوقات عبارت میں کسی قسم کی غلطی و ابہام کی وجہ سے صحیح معنی اور مفہوم اخذ نہیں ہو پاتا؛ چنانچہ اس مرحلے کو اگر پہلے ہی عبور کر لیا جائے تو یقیناً آپ مکمل اطمینان و سکون کے ساتھ طلبہ کو سمجھا سکتے ہیں۔ اسی طرح عبارت کے مالحذا و ماحلیہ کی آگاہی اور واقفیت سے افہام کا راستہ آسان اور سہل ہو جاتا ہے۔ سبق کی روانی اور رفتار بھی متاثر نہیں ہوتی۔ یاد رکھئے! سمجھانے سے قبل سمجھنا، بولنے سے پہلے سوچنا اور کرنے سے پیشتر متانج پ نظر رکھنا، آپ کے انداز تدریس اور معیار تعلیم پر خوش گوار اور دیر پا اثرات ڈال سکتے ہیں۔

### ۳- اسلوب تعلیم:

ہر انسان کو خالق کائنات نے مختلف خوبیوں اور محاسن سے نوازا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھائی اور

خوبی کسی انسان میں ہو تو لازماً دوسرے فرد میں بھی پائی جائے؛ مگر چند ایسی صفات ضرور ہیں جو مشترکہ طور پر ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کون کتنا اور کس خوبی سے اس کو اپنے تصرف میں لا کر اپنے لیے ترقی کی منزلیں قریب کرتا ہے۔ ایک مقبول اور ہر دل عزیز استاد کی پہچان اور اُس کا تعارف یہ ہے کہ وہ سبق اور درس کو شاگردوں کے ذہن و فہم کے قریب لے آئے۔ یہ قرب و نزدیکی اس قدر ہو کہ کوئی طالب علم اُس کتاب و سبق سے وحشت و تنگی اور بُعد محسوس نہ کرے؛ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ جواب بہت سیدھا اور آسان ہے۔ درس ہمیشہ ”تقطع اور تجزی“ کے اصول پر پڑھایا جائے۔ یعنی دانش گاہ میں قدم رکھنے سے قبل ہی آپ ذہن اس بات کو متحضر کر لیں کہ آج میرے سبق میں کتنی باتیں، کتنے مباحث، کتنے فائدے اور کتنے نکات ہوں گے؟ اس تعین و تجدید کے بعد عبارت پر ان کو منطبق کر دیں۔ ان شاء اللہ العزیز کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

۴۔ طلبہ کی استعداد:

بلاشبہ ہر اچھے مدرس کی تمنا اور آرزو ہوتی ہے کہ اس کے طلبہ علمی لیاقت اور فنی استعداد میں مضبوط اور پختہ ہوں۔ اس خواہش کے ٹھکونے اسی وقت چٹکیں گے، جب آپ طلبہ کو بھی اپنی تدریسی عمل کا حصہ بنالیں۔ اس کی پہلی صورت تو یہ ہے کہ: روزانہ کی بنیاد پر ان سے عبارت خوانی کروائی جائے۔ ”سب نہ سہی، ایک سہی، زیادہ نہ سہی، مختصر سہی“ کے اصول اور ضابطے کو سامنے رکھ کر چلا جائے تو بہت کچھ پایا جاسکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ: گزشتہ سبق کا حتی الامکان اعادہ کروائیں، چاہے خود سن کر یا آپس میں تقسیم کر کے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ: ہفتے دو ہفتے میں سابقہ خواندگی کا سرسری لیکن تنقیدی جائزہ لیں۔ ان امور کی رعایت سے استاد کے ذہن میں بھی نئی نئی باتیں اور اچھوتے خیالات جنم لیتے ہیں، جو عمل کی بھٹی سے نکل کر گزند کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ ضرورت ہے فقط ہمت اور حوصلہ کی۔

۵۔ مصطلحات فن اور طلبہ:

اولین اور بنیادی درجات میں اس بات کا التزام و لحاظ رکھا جائے کہ طلبہ کو صرف و نحو، فقہ و اصول فقہ، اصول تفسیر و حدیث اور منطق و بلاغت کے مصطلحات و اصطلاحات خوب از بر ہوں۔ شروع میں اس اہم اور طالب ریاضت مرحلے کو نظر انداز کر دینے کا نقصان آخر تک نظر آتا ہے۔ ابتدائی طالب علموں کے اذہان و افکار اس خام مال کی طرح ہیں، جسے ماہر اور موقع شناس کارِ گیر کسی بھی عمدہ سانچے اور خوب صورت ظرف میں ڈھال سکتا ہے؛ چنانچہ اس وقت کا معیاری اور کامیاب استعمال اسی صورت ممکن ہے جب ان تازہ ذہنوں کو ماہر و مشاق مدرس اپنے متعلقہ فن کی

موٹی موٹی تعریفات مثالوں کے ساتھ یاد کرادے۔ جو آگے چل کر ان کے لیے مطولات کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

## ۶۔ علمی تفہمی کی آبیاری:

حدیث مبارکہ میں رسول معلم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اور کٹھن رس سوال کو ”آدھا علم“ فرمایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ طالبان علوم نبوت میں یہ علمی پیاس اور تفہمی کا ذوق و شوق کیسے اور کیوں پیدا ہو سکتا ہے؟ یا کیا جاسکتا ہے؟ اس کا حل احادیث مبارکہ کی کتب میں موجود ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت سے ایک سوال فرمایا، کسی کو جواب نہ آیا۔ میں جان گیا کہ اس سوال کا کیا جواب ہے؛ لیکن شرم و حیا اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے، مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ شیخ عبدالفتاح ابو غندہ رحمہ اللہ اپنی کتاب ”الرسول المعلم.....“ میں مندرجہ حدیث شریف کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں: ”استاذ کے لیے مستحب ہے کہ وہ اپنے متعلمین و مستفیدین سے از خود سوال کرے۔ جس کے ذریعے ان کے اندازِ فہم کی جانچ و پرکھ کے ساتھ ساتھ، ان میں غور و فکر اور سوچ و پکار کی جانب رغبت و شوق پیدا کرنے کی کاوش شامل ہو۔ اگرچہ معلم طلبہ کے سامنے اس بات کو اس انداز میں بیان کر چکا ہو، کہ وہ اپنی کم فہمی اور نا سمجھی کی بنا پر اس سوال کی گہرائی اور حقیقت تک نہ پہنچ سکے ہوں۔“ (ص: ۱۰۸)

۷۔ دورانِ درس ناصحانہ کلمات:

والد اور استاذ کے مابین کلیدی فرق و امتیاز یہ ہے کہ باپ اپنے بچے کی مادی اور ظاہری و جسمانی نشوونما کرتا ہے؛ جب کہ ایک مشفق و مہربان استاذ اپنے شاگرد کی باطنی اور روحانی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ ہر باصلاحیت معلم اور جوہر شناس استاذ کی نظر ہمہ وقت اپنی روحانی اولاد کی سیرت و کردار پر رہتی ہے، اور کیوں نہ ہو؟ کہ اس قیمتی اور زریں دور کی کمی اور کمی پوری عمر کا روحانی روگ بن سکتی ہے؛ اس لیے ضرورت ہے کہ حقیقت پسند اور نفسیات شناس مدرس اپنے آپ کو فقط کتاب کی تدریس و تعلیم تک محدود نہ کرے؛ بلکہ دورانِ درس کوئی نصیحت آموز کلمہ، کوئی فکر انگیز واقعہ، کوئی نظریہ ساز جملہ کہہ کر اپنے زیر تربیت نو بہاولوں کی عملی زندگی کا دھارا بدلنے میں مثبت اور نتیجہ خیز کردار بھی ادا کرے۔

## ۸۔ معتدل مزاجی:

طلبہ کے ساتھ اعتدال، میانہ روی اور دوستانہ رویہ، ان کی فکری، علمی اور ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے

اور نکھارنے میں بے حد مفید و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جہاں خشک مزاجی، بے جا غصے کا اظہار اور حد اعتدال سے بڑھی ہوئی سختی اور تشدد آپ کو طالب علم سے دور کر دیتی ہے، وہاں افراط کی شکار نرمی، طبیعت میں عدم سلیقہ کا عنصر اور طلبہ سے فضول گپ شپ بھی درس گاہ کے عمومی اور آپ کے پڑھانے کے ماحول کو متاثر و بدناما کرتی ہے۔ ایسی فضا اور ماحول جس میں توسط و اعتدال کا رنگ نمایاں ہو، آپ کی ذہنی چٹنگی اور بہترین انتظام کا مظہر سمجھی جائے گی۔ ورنہ اس معاملے میں کسی بھی قسم کی کمی یا کوتاہی سے پیدا ہونے والے نتائج کا سد باب ناممکن اور محال ہے۔

۹۔ طلبہ میں امتحانی شعور اجاگر کرنا:

ایک کسان کے لیے انتہائی خوشی اور مسرت کا سب سے بڑا لمحہ وہ ہوتا ہے، جب اسے اپنے ہاتھوں بویا ہوا بیج..... ایک لہلہاتی، ہوا کے دوش پر لپکتی اور ہری بھری فصل کی صورت میں نظر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح صاحبِ دل استاد کے لیے راحت اور عزت کا مکمل سامان اس وقت میسر ہوتا ہے، جب اس کے ہونہار طلبہ امتیازی اور نمایاں حیثیت و مرتبہ حاصل کریں۔ اگرچہ امتحان دینا شاگرد اور متعلم کا کام ہے، مگر اس کی تیاری کے لیے لائحہ عمل، طریقہ امتحان کی وضاحت اور لکھنے کے ڈھنگ کی صورت گری جیسے مراحل استاد کے ہاتھوں ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ جائزہ چاہے تحریری ہو یا تقریری۔ ہر دو کے لیے چند راہ نما اور سودمند ہدایات بتلانے سے طالب علم کا حوصلہ بڑھتا ہے، اسے ڈھارس ملتی ہے، اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ایک قوت میری سرپرستی اور راہ دکھلانے والی موجود ہے۔ اس احساس کا منطقی نتیجہ بہت خوش گوار اور فرحت بخش ہوتا ہے۔

۱۰۔ اساتذہ میں باہم جوڑ و اتفاق:

کوئی ادارہ، جماعت اور معاشرہ ایک فرد و انسان سے مکمل نہیں ہوتا۔ مختلف مزاج اور متفرق طبیعتیں مل کر ہی کسی مدرسہ، اسکول اور گھر کو وجود بخشی ہیں۔ ان الگ الگ مزاجوں اور طبیعتوں کا کسی امر پر متفق و متحد ہو جانا، اس کی پائیداری، مضبوطی اور چٹنگی کے لیے بنیادی و کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس افتراق و انتشار، فتنہ و فساد اور ٹوٹ پھوٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ قابل، محنتی اور مخلص استاد کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی ذات، کردار اور شخصیت؛ مدرسہ، اسکول اور ادارے کے مجموعی ماحول کے لیے نمکدور اور خرابی کا باعث و سبب نہ بنے۔ اس کے کسی قول و عمل سے دوسرے کی دل آزاری اور دل شکنی نہ ہو۔ ایک شخص اور فرد کا یہ عزم، ارادہ اور نیت پورے ادارے اور جماعت کے استحکام و دوام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ورنہ ایک چنگاری ہی پورے ڈھیر کو راہک بنا دینے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو صحیح معنوں میں دین کا خادم و سپاہی بنائیں! آمین!